رائیگاں مسافتیں

طاہر جاوید مغل

ایک بار دیکھنے کے بعد وہ اُسے کبھی نہیں بھولا، دل کے نہاں خانے میں اُس کی تصویر سجائے اُسے ڈھونڈتا ہی رہا اور بالآخر اُس تک پہنچ گیا مگر ـــ یوں بھی ہوتا ہے کبھی دُور سے آنے والا ـــ پاس آتے ہی بہت دُور چلا جاتا ہے۔ مسافتیں رائیگاں ہی جاتی ہیں

اُس مسافر کی کہانی جس نے ایک نئے ہم سفر کے لیے راستہ بدل لیا تھا

پرویز عرف جمی آج بہت خوش تھا۔ بات تھی بھی خوش ہونے کی۔ انہوں نے ٹھیک ٹھاک ہاتھ مارا تھا۔ وڈیو سینٹر سے ایک وڈیو کیمرا، دو ٹیپ ریکارڈر اور تین وی سی آر ہاتھ لگے تھے۔ ... کچھ نہیں تو یہ پچاس پچپن ہزار کا مال ضرور تھا۔ مال کوٹھی کے تہہ خانے میں ٹھکانے لگانے کے بعد جمی اور اس کے دونوں دوست مراد اور شکورا ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ وہ کچھ دیر آج کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر آئندہ کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد لیٹ گئے۔ شکورے اور مراد کو جلد ہی نیند آگئی لیکن جمی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایسے موقعوں پر اکثر اس کا ذہن انتشار کا شکار رہتا تھا۔ چوری چھوٹی ہو یا بڑی کم از کم دو راتوں کے لئے جمی کی نیند اڑ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ اکتا کر نیچے تہہ خانے میں گیا اور ایک مسروقہ وی سی آر اوپر اٹھا لایا۔ ۲۴ انچ کے رنگین ٹیلیویژن میں لیڈ لگانے کے بعد سوئچ آن کر کے اس نے ایک انڈین فلم کی کیسٹ وڈیو میں داخل کرنا چاہی تو پتا چلا کہ اس میں پہلے سے ہی ایک کیسٹ موجود ہے۔ یونہی کیسٹ چیک

کرنے کے لئے اس نے پلے کا بٹن دبادیا اور صوفے پر بیٹھ کر اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ جلد ہی تصویر نمودار ہوئی۔ یہ کسی شادی کی فلم تھی۔ اُبٹن کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ کسی امیر گھرانے کے لوگ لگتے تھے۔ رنگ برنگے لباس پہنے' خوبصورت لڑکیاں ڈھولک پر گیت گارہی تھیں۔ کچھ ادھر اُدھر چہکتی پھر رہی تھیں۔ ہر طرف حسن' خوشبو اور رنگوں کی بہار تھی۔ یوں ہی دل بہلاوے کے لئے ججی فلم دیکھنے لگا۔ اُبٹن کے بعد مہندی کی رسم ادا ہوئی اور پھر شادی کا سین آگیا۔ ان تمام تقریبات میں..... دراز قد اور لمبے بالوں والی ایک لڑکی بار بار نظر آرہی تھی۔ شربتی آنکھیں۔ ترشے ہوئے ہونٹ' صراحی دار گردن اور سراپا دلکش۔ ہر ادا دلنشیں۔ جب بھی اس کا چہرہ اسکرین پر دکھائی دیتا ججی کے دل سے ایک ہوک سی اٹھ جاتی کیونکہ نامعلوم لڑکی ان تقریبات کی "جانِ محفل" تھی۔ ہر کام میں آگے آگے' ہر موقع پر پیش پیش۔ کبھی دلہن سے سرگوشیاں کررہی ہے' کبھی گیت گارہی ہے' کبھی مہمانوں کو مشروبات پیش کررہی ہے اور کبھی بڑی بوڑھیوں کے ساتھ اہم مشوروں میں مصروف ہے۔ شادی کے روز نکاح کے بعد اور رخصتی سے پہلے فلم اچانک ختم ہوگئی۔ ججی کو اس بات پر حیرانی ہوئی۔ بات تھی بھی حیرانی کی۔ ابھی تو کئی رسومات باقی تھیں اور پھر اگلے روز ولیمے کی تقریب بھی ہونا تھی۔ ججی نے مزید فلم چلا کر دیکھی لیکن اس کے بعد کوئی منظر اسکرین پر نہیں آیا۔ آخر وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید فلم کو کسی دوسری کیسٹ سے اس کیسٹ پر منتقل کیا جارہا تھا اور ابھی منتقلی کا یہ کام ادھورا تھا کہ وہ وی سی آر چرا کر یہاں لے آیا۔ اس فلم میں مذکورہ لڑکی کے کردار نے ججی کے دل پر بے پناہ اثر کیا۔ وہ دیر تک اس نامعلوم لڑکی کے حسین تصور میں کھویا رہا۔ اس رات صبح ہونے تک ججی نے وہ فلم کم از کم تین بار دیکھی۔ اور یہ صرف شروعات تھیں' اس ندیدے پن کی جس کا اظہار آئندہ دنوں میں ججی کی طرف سے ہوا۔

ایک ہفتے کے اندر پرویز عرف ججی کو اس فلم کا ایک ایک سین ازبر ہوگیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس پورے خاندان اور اس کے ایک ایک فرد کی عادات کو جاننے اور سمجھنے لگا ہے۔ اور اس عجیب و غریب' غائبانہ تعلق کی واحد وجہ وہ حسینۂ دلنواز ہی تھی جو پہلے روز ججی کے ہوش و حواس پر بجلی گرا گئی تھی۔ ججی کوئی ایسا طفلِ مکتب بھی نہیں تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور رنگ رنگ کے لوگ دیکھے تھے۔ عورت اس کے لئے پہیلی تھی اور نہ حسن ہی کوئی معما۔ گو اس کی عمر بائیس سال تھی مگر وہ سیکڑوں بار ان پیچ و خم سے گزر کر ان گتھیوں کو سلجھا چکا تھا۔

وہ شہر کے مضافات میں ایک کچی' گندی اور نشیبی بستی کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ نے ساری عمر "تخت" پر گزاری تھی۔ گرمیوں میں وہ اس تخت پر برف رکھ کر بیچتا تھا اور سردیوں میں پھل لگا لیتا تھا۔ ججی اس بستی کا سب سے لائق بچہ تھا۔ اس نے نہ صرف دس جماعتیں پاس کی تھیں بلکہ سال ڈیڑھ سال کالج کی ہوا بھی کھائی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی "لیاقت" اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔ اس کا غصیلا باپ ایک خریدار کے پیٹ میں برف توڑنے والا سُوا گھونپنے کے جرم میں دو سال کے لئے جیل جاتے وقت ججی کو تخت نشین کر گیا تھا تاکہ وہ برف بیچ کر اپنا اور بہن بھائیوں کا پیٹ پال سکے۔ برف بھی بھلا کسی کو زندگی دے سکتی ہے؟ وہ تو ویرانی اور موت کی علامت ہے۔ ججی کو اس کا احساس تھوڑے ہی دنوں میں' ہوگیا تھا۔ ان کے قریب ہی سانسیوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ... سانسیوں کے لڑکے اکثر اس کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے۔ انہی میں ایک کا نام مراد اور ایک کا شکورا تھا۔ وہ دونوں خاندانی چور تھے اور بڑے فخر سے اپنے پیشے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کی آمد و رفت کے دوران نہ جانے کس گھڑی ججی کے دل میں ایک چور دروازہ چپکے سے کھل گیا۔ ان کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں بھی ایک بڑا اور قابل چور بننے کی امنگ پیدا ہوگئی... اور پھر خربوزوں کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا چلا گیا۔

اب وہ ایک تجربہ کار چور تھا۔ اس کے ساتھی اس کی تجربے کاری اور ہوشیاری کا اعتراف کرتے تھے... مگر پچھلے کئی روز سے وہ بھی الجھن کا شکار تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ججی یہ کیا پاگل پن کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے' لڑکی خوبصورت اور دل موہ لینے والی تھی مگر یوں اس کا گرویدہ ہو کر آٹھوں پہر آہیں بھرنا کہاں کی عقلمندی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی؟ کس شہر کی رہنے والی تھی؟ شادی شدہ تھی کہ غیر شادی شدہ؟ اور اگر وہ اسے مل بھی جاتی اور اس کے تمام حالات ججی کے موافق بھی ہوتے تو... پھر بھی کیا ہونا تھا۔ کیا وہ ججی کی دسترس میں آجاتی؟ اسے دیوانے کا خواب ہی کہا جاسکتا تھا۔ کہاں وہ نیچ ذات کا چور' کہاں وہ اعلیٰ خاندان کی شریف زادی۔ حرام خوری' حرام خور کے چہرے پر لکھی جاتی ہے۔ وہ کتنے بھی نقاب ڈال لے' پہچاننے والی آنکھ پہچان جاتی ہے۔ لب و لہجہ' چال ڈھال' اطوار و انداز' ہر بات چغلی کھاتی ہے کہ کون کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ وہ شریف زادی تو شاید ججی پر دوسری نظر بھی ڈالنا پسند نہ کرتی... اور یہ عاشقِ نامراد تھا کہ ہر وقت ٹانگیں پسارے وی سی آر میں اس کی کیسٹ لگائے بیٹھا رہتا تھا اور شاید خیالِ یار میں گم رہنے ہی کو حاصلِ زندگی سمجھ رہا تھا۔

آخر ایک دن وہی ہوا جس کا شکورے اور مراد کو خطرہ تھا۔

جمی نے ان دونوں کو بلایا اور سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا "یارو! اس لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔"

شکورے نے ٹھنڈی سانس بھری "استاد رحم کر۔ اپنے اوپر بھی اور ہمارے اوپر بھی۔ کیوں دکھری لائن پکڑلی ہے تونے؟... ہم جیسوں کو ایسے دھندوں میں کچھ ملنے والا نہیں ہوتا۔"

حالانکہ شکورا اور مراد سینئر چور تھے مگر وہ اب جمی کو استاد کہتے تھے اور واقعی اس نے خود کو استاد ثابت کر کے دکھایا تھا۔ جمی نے ان دونوں کو کھاجانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، میں تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ جب تک میرے دل کو سکون نہیں آئے گا، میں کوئی کام نہ کرسکوں گا۔ اگر کروں گا تو غلط کروں گا اور اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی چھتر کھلاؤں گا۔ تم نے سنا ہی ہوگا، جان ہے تو جہان ہے... اور میری جان اس وقت سخت شکنجے میں ہے۔"

مراد نے مسکین لہجے میں کہا "استاد جی! لگے ہاتھ ذرا یہ بات بھی کھول دو کہ تمہاری جان کو سکون ملے گا کیسے؟ صرف اس لڑکی کو دیکھ کر یا میل ملاقات کرکے... یا پھر شادی وادی اور بچوں وچوں کا ارادہ ہے... میرا مطلب ہے، کچھ تو پتا چلے کہ کتنا بخار ہے؟"

جمی نے مراد کو ایک شاندار گالی دی۔ پھر اچانک اس کی پسلیوں میں ٹانگ جو ماری تو وہ اچھل کر مسہری سے نیچے جاگرا۔ جمی کی دوسری ٹانگ اس کے بھدے چہرے پر پڑتی لیکن اس نے چوکسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ٹانگ بازوؤں میں جکڑلی۔ جمی دوسری ٹانگ سے اس کے ہاتھوں کو رگید کر پنڈلی چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر مراد نے ٹانگ چھوڑ کر اپنی عافیت کو خطرے میں نہیں ڈالا۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان یہ دلچسپ کشمکش جاری رہی پھر مراد اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ کمرے میں موجود ہنسی مذاق کی فضا ختم ہوگئی تو جمی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے، میں تم لوگوں کے لئے پریشانیاں پیدا کررہا ہوں۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ شاید میں تم لوگوں کے کسی کام کا نہیں رہا۔"

شکورے نے اسے سنجیدہ ہوتے دیکھا تو چہک کر بولا۔

"استاد! اتنی مایوس شکل تو نہ بناؤ۔ کون سا کسی کی آنکھ سے کاجل چرانا ہے ایک لڑکی ہی ڈھونڈنی ہے نا شہر میں... ڈھونڈلیں گے۔ کہاں جائے گی ہم شکروں سے بچ کر؟"

مراد نے کہا "ہم دولت کے چور... وہ دل کی چور۔ ہیں تو دونوں چور ہی، پہچان لیں گے اس چورنی مورنی کو..."

لیکن اگلے دو ہفتوں میں شکورے اور مراد کے تمام دعوے غلط ثابت ہوئے۔ وہ نامعلوم لڑکی کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ جمی ان دونوں کو موردِ الزام کیا ٹھہراتا وہ خود بھی سر توڑ کوشش کے باوجود کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا۔ ان تینوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہاتھ پیر بچا کر کام کرنا چاہتے تھے۔ صرف چند روز پیشتر انہوں نے ایک زبردست

ہاتھ مارا تھا اور مقامی تھانے کی پولیس ابھی تک جلے پاؤں کی بلی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی کا سراغ انہیں اس وڈیو سینٹر سے مل سکتا تھا جہاں سے انہوں نے فلم چرائی تھی۔ ظاہر ہے سینٹر والے شادی بیاہ کی فلم بندی بھی کرتے تھے۔ اور یہ فلم اسی سلسلے میں وہاں پڑی ہوئی تھی۔ شاید ڈبنگ وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔ یقیناً وڈیو سینٹر والا بتا سکتا تھا کہ اس نے یہ فلم کہاں جا کر بنائی تھی۔ ایک دفعہ شادی والے گھر کا پتا معلوم ہو جاتا تو پھر کسی طرح اس ماہ جبیں کا سراغ بھی لگایا جا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وڈیو سینٹر کا مالک اور اس کا کاریگر دونوں حوالات میں تھے۔ مال مسروقہ کے مالکان میں سے کسی نے ان پر الزام لگا دیا تھا کہ لوگوں کی اشیاء ہضم کرنے کے لئے انہوں نے خود ہی چوری کا ڈھونگ رچایا ہے۔ مستقبل قریب میں ان دونوں کے چھوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وڈیو سینٹر کو پولیس نے مقفل کر رکھا تھا اور وہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ مطلوبہ لڑکی کا کھوج لگانے کے لئے ان تینوں میں سے کوئی حوالات میں جا کر حوالاتیوں سے ملاقات کرے اور ان سے پوچھے کے بتاؤ صاحبان، کہاں جا کر تم نے اس فتنہ سامان کی فلم بنائی تھی۔ اب لے دے کے ایک ہی کام رہ جاتا تھا کہ دونوں حوالاتیوں کی ضمانتیں ہونے کا انتظار کیا جائے۔

اس دوران شکورے اور مراد نے ایک اور مشغلہ ڈھونڈ لیا۔ ... شادی کی فلم کے شروع میں اس کا ٹائیٹل بھی تھا جس پر شادی کی تاریخ اور دلہا دلہن کے نام بھی دیے ہوئے تھے۔ دلہا کا نام آفتاب قریشی اور دلہن کا فوزیہ قریشی تھا۔

اس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ قریشیوں کی کوئی شادی تھی۔ جو تقریباً تین ہفتے پہلے بعد از شام انجام پائی تھی۔ اسی علاقے میں کہیں دلہن یا پھر دلہا کا گھر موجود تھا۔ عام طور پر ویڈیو فلم دلہا والے بنواتے ہیں، اس لئے زیادہ امکان یہی تھا کہ اس علاقے میں دلہا کا گھر ہوگا۔ یہ نتائج اخذ کرنے کے بعد مراد اور شکورے نے کسی ایسی قریشی فیملی کا کھوج لگانا شروع کر دیا جن کے ہاں پچھلے دنوں شادی کی تقریب ہوئی ہو۔ لیکن یہ کوشش بھی دوسری کوششوں کی طرح لاحاصل اور رائیگاں ثابت ہوئی۔ پھر اسی دوران انہیں ایک دوسری حوصلہ شکن اطلاع ملی۔ وڈیو سینٹر کے مالک اور اس کے کاریگر کی ضمانتیں نہیں ہو سکی تھیں۔ کیونکہ دوران تفتیش وہ قتل کے ایک پرانے کیس میں ملوث ہو گئے تھے اور اب ان کا جلد باہر آنا بعید از قیاس تھا۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پرویز ججی نے ایک عاشق نامراد کی طرح طویل اور سرد آہ بھری اور پھر وہی کیا جو ایسے موقعوں پر بعض نامراد عاشق کیا کرتے ہیں۔ یعنی وہ دو تین روز تک نشے میں مدہوش سگریٹ پھونکتا رہا اور ایک چمکیلے چہرے کو شعور کے آتش کدے سے تحت الشعور کے سرد خانے میں دھکیلتا رہا۔ پتا نہیں، وہ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں لیکن چوتھے روز جب اس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور دوستوں کے ساتھ ایک نئی پنجابی فلم دیکھی تو کافی بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔

☆○☆

قریباً ایک سال بعد کی بات ہے، ان دنوں ججی اور اس کے دوسرے ساتھی راولپنڈی میں مصروف کار تھے۔ وہ دسمبر کی ایک نہایت سرد اور تاریک رات تھی۔ انہوں نے ایک کوٹھی میں کامیاب واردات کی۔ نقدی، زیورات اور چند ہلکی پھلکی قیمتی اشیاء کی صورت میں پچاس ساٹھ ہزار کا مال ہاتھ آیا۔ مراد کوٹھی سے کچھ فاصلے پر پک اپ لئے تیار کھڑا تھا۔ شکورا اور ججی کوٹھی کی عقبی چار دیواری پھلانگ کر بھاگتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہوئے اور پھر اپنی پک اپ تک پہنچ گئے۔ وہ ہانپتے ہوئے اندر گھسے اور مراد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چند لمحے انہیں سانسیں درست کرنے میں لگے۔ ججی محسوس کر رہا تھا کہ شکورے کا سانس کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا تھا۔ شاید اس کی کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ججی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"استاد! آج تو کمال ہی ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟"

شکورے نے سخت سردی میں ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ "تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جس کی کیسٹ تم دو ہفتے تک مسلسل دیکھتے رہے تھے... ؟"

"ہاں"۔ ججی نے چونک کر بے ساختہ کہا۔

شکورے نے کہا "وہ ادھر کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر سوئی ہوئی تھی۔"

ججی کچھ دیر حیرت سے شکورے کی طرف دیکھتا رہا۔ پک اپ کی اندرونی، مدھم روشنی میں اس کی آنکھوں میں جیسے چراغ سے جلنے لگے تھے لیکن ان چراغوں کی روشنی پر بے یقینی کی دھند بھی منڈلا رہی تھی "تم... تم نے اچھی طرح دیکھا تھا؟"

شکورے نے کہا "کیا بات کرتے ہو استاد! چور کی آنکھ ہے، ...کوئی پولیس والا نہیں ہوں میں۔ کمرے میں نیلا بلب جل رہا تھا۔ مسہری کے برابر کی ٹیبل سے دو جھمکے اٹھائے ہیں میں نے۔ ...لڑکی مجھ سے ایک فٹ کی دوری پر مدہوش پڑی تھی۔ ایسی نمکین صورت ہے کہ میرا تو دل "ایماندار" ہونے لگا۔ جھمکے بھول کر میں اسی کو دیکھتا چلا گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے، عورت ذات مرد کو راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔"

ججی نے اپنی اندرونی مسرت چھپاتے ہوئے شکورے کو غصیلی نظروں سے گھورا۔ پھر اوپر تلے سگریٹ کے کئی کش لے کر اس سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔

بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ پرانے درد پھر جاگ گئے تھے۔ بھولی بسری سب چوٹیں یاد آنے لگی تھیں۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی جبی نے صندوق میں سے پھر وہی کیسٹ نکالی جسے ہروقت وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس وی سی آر نہیں تھا لہٰذا یوں ہی کیسٹ کو ہاتھوں میں پکڑ کر عجیب سے انداز میں دیکھتا رہا۔ اس کی ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹوٹوں کا انبار لگ چکا تھا۔ شام کو وہ نئے کپڑے پہن کر موقع واردات کی طرف چلا گیا اور رات گئے تک اس کوٹھی کے ارد گرد منڈلاتا رہا۔ اس کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ کوئی نو بجے شب ایک سفید سوزوکی کار کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ جبی اس سفید کار کی کھڑکی میں اس چہرے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہا جس نے اسے اب تک ہزار رنگ سے ستایا اور تڑپایا تھا... جس نے اسے خیالوں میں پریشان کیا تھا اور خوابوں میں آبلہ پا دوڑایا تھا۔

ٹھیک دو روز بعد رات کے ایک بجے جبی بغل میں ایک گٹھری دبائے کوچۂ جاناں کے پھیرے لگا رہا تھا۔ اس گٹھری میں وہ تمام سامان موجود تھا جو اس نے اپنی محبوبہ کے گھر سے چرایا تھا۔ خاصی کوشش کے بعد وہ کوٹھی کے عقب میں پہنچ سکا۔ پھر کچھ فاصلے سے اس نے باؤلنگ کرانے کے انداز میں گٹھری گھما کر کوٹھی کے صحن میں پھینک دی۔ گٹھری گرنے کی مدّھم آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی۔ اس آواز کے بعد ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ کوٹھی کے اندر یا باہر کسی قسم کی کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ جبی کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ خود بھی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ معمولی کوشش کے بعد اسے صحن میں گٹھری نظر آگئی۔ گٹھری دوبارہ اٹھانے کے بعد وہ کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا اور بے انتہا مہارت اور چالاکی کے ساتھ دو جالی دار دروازے کھولتا ہوا رہائشی حصے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اسے ایک بند دروازے کے تالے سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا تار نکالا اور پانچ منٹ کی کوشش کے بعد یہ دروازہ بھی کھول لیا۔ ایک تاریک راہداری میں چند قدم بے آواز چلنے کے بعد اس نے خود کو نیلگوں نائٹ بلب والی خوابگاہ میں پایا۔ اس کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں اور دل وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ وہ سانس روکے دیکھتا چلا گیا۔ اس کے خوابوں کی شہزادی چند قدم کے فاصلے پر بے خبر سو رہی تھی۔ مخملی لحاف کا کنارا اس کے سینے سے سرک کر گداز پیٹ کے نشیب میں آٹھہرا تھا۔ بالوں کی دو پریشان لٹیں اس کے رخساروں اور ہونٹوں کو چوم رہی تھیں۔ کتنی پاکیزگی اور معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔ ڈبل بیڈ پر ایک دوسرا جسم بھی موجود تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اور شاید لڑکی کی ماں تھی۔ اس کی سو دانوں والی تسبیح ابھی تک ایک کلائی میں لپٹی ہوئی تھی۔ دو تین گز کے فاصلے پر ایک اور شخص سو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا یہ ایک بزرگ صورت شخص تھا۔ بزرگ گہری نیند سو رہا تھا جس کا اندازہ اس کے مدھم خراٹوں سے ہوتا تھا۔ اس کے تکیے کا مانوس ابھار دیکھتے ہی جبی سمجھ گیا کہ اس کے نیچے بھرا ہوا ریوالور موجود ہے۔ یقینی بات تھی کہ ان احتیاطی تدابیر کا سبب وہ واردات ہی ہے جو چند روز پہلے جبی اور اس کے ساتھیوں نے کی تھی۔

جبی کچھ دیر دروازے میں گم صم کھڑا اہلِ خانہ کے خوابیدہ چہرے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا داہنا ہاتھ جیسے خود بخود اپنی چرمی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھ گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک نیلا رومال نکالا۔ اس نیلے رومال کے اندر کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے اس نے رومال کو کھولا۔ مدّھم روشنی میں ایک چھوٹی سی شیشی چمکنے لگی۔ قریباً ساٹھ ملی لیٹر کی اس شیشی میں کوئی محلول ہلکورے لے رہا تھا۔ جبی نے بڑے دھیان کے ساتھ یہ محلول رومال پر چھڑکا۔ پھر آگے بڑھ کر رومال خوابیدہ شخص کی ناک پر رکھ دیا۔ خوابیدہ شخص ذرا سا کسمسایا۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کے خراٹوں کا آہنگ بدل گیا۔ اب اس کی آواز دھیمی اور سست ہو گئی تھی۔ جبی نے ایک دوبار اسے ہلا کر دیکھا پھر مطمئن ہو کر عورت کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسے بھی کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر چکا تھا۔ بوتل کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے اس نے کلوروفارم جیب میں رکھ لیا۔ یہ کلوروفارم اسے ایک واردات میں ہی ملا تھا۔ وہ اس محلول کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا لہٰذا خاص خاص موقعوں پر ہی اسے استعمال کرتا تھا۔ مرد و عورت کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے کوٹھی کے مختلف کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ حسبِ سابق گھر میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ مطمئن ہو کر وہ خوابگاہ میں واپس چلا آیا۔ اس نے مسروقہ سامان والی گٹھری اٹھا کر لڑکی کے پیروں میں رکھ دی۔ پھر سرہانے کھڑا ہو کر بڑی محویت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اسی محویت کے عالم میں گھٹنے ٹیک کر وہ لڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور شہادت کی لرزاں انگلی سے اس کی زلفوں کو رخساروں اور ہونٹوں سے پیچھے ہٹانے لگا۔ اس کی انگلی کو جیسے ان زلفوں سے بھی رقابت محسوس ہو رہی تھی۔ زلفیں اپنے مقام پر پہنچ گئیں تو اس کی بے قرار انگلی لڑکی کے عارض پر گردش کرنے لگی۔ اسی وقت لڑکی نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ چند انچ کے فاصلے پر ایک اجنبی مرد کا چہرہ دیکھ کر اس کی پتلیاں پھیل گئیں پھر میکانکی انداز میں اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ منہ کھول کر پوری قوت

سے چیختی، جمی کا مضبوط ہاتھ اس کے ہونٹوں کو ڈھانپ چکا تھا۔ لڑکی کی چیخ ایک سنسناہٹ کی صورت جمی کی ہتھیلی میں ڈوب کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ کرنے میں جمی کو بالکل دقت پیش نہیں آئی نہ وجہ یہی تھی کہ وہ لڑکی کے اس ردِّ عمل کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ لڑکی پر ہسٹیریا کا پہلا شدید حملہ گزر گیا تو وہ اردگرد کے حالات کو سمجھنے لگی۔ جمی نے اپنے پُر خلوص لہجے میں اسے باور کرادیا کہ وہ اسے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور اگر وہ اس کی چند باتیں سن لے تو وہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔ لڑکی اس کی توقع سے زیادہ سمجھدار اور باہمت نکلی۔ اس نے سر کی جنبش سے جمی کو بتایا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق شور نہیں کرے گی۔ مطمئن ہونے کے بعد جمی نے آہستگی سے ہاتھ اس کے ہونٹوں سے ہٹالیا۔ جمی نے صاف گوئی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ وہی چور ہے جس نے چند روز پہلے انہیں نقدی وزیورات سے محروم کیا تھا۔ پھر اس نے پائنتی میں رکھی گٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں آپ کا مال لوٹانے آیا ہوں۔ میں یہ گٹھڑی صحن میں ہی پھینک کر چلا جانا چاہتا تھا... مگر پھر خیال آیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ لہٰذا بہتر سمجھا کہ آپ کا مال آپ کے سپرد کر کے جاؤں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت آمیز خوف کی بہتات تھی۔ وہ کبھی گٹھڑی کو اور کبھی جمی کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اس بات پر بھی حیران ہو رہی تھی کہ وہ اتنی بلند آواز میں بول رہا ہے اور اس کے باوجود اس کے والدین میں سے کوئی نہیں جاگا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جمی نے لڑکی سے درخواست کی کہ وہ دوسرے کمرے میں چل کر اس کی چند باتیں سن لے۔ ... اس مرحلے پر لڑکی کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر اندیشوں کی دھند چھا گئی۔ شاید وہ جمی کو بے ضرر سمجھنے کے باوجود اس کمرے سے باہر جانا نہیں چاہتی تھی۔ جمی نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اسے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اس کے والدین خواب آور دوا کے زیرِ اثر ہیں اور اگر خدانخواستہ اس کی نیت خراب ہو تو وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا کمرا بدلنے سے کسی طرح کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ والدین کی بے ہوشی کا سن کر لڑکی اپنی خوبصورت اور لرزاں آواز میں سخت تشویش کا اظہار کرنے لگی۔ جمی نے بمشکل اسے یقین دلایا کہ یہ بے ہوشی عارضی اور قطعی بے ضرر ہے اور وہ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

☆○☆

گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے صبح کے اُجالے کی طرف سرک رہی تھیں۔ اُجالا جو مجرموں کے لئے "اختتامِ کار" ... کا نقیب ہوتا ہے۔ جو انہیں اندیشوں کی ڈور سے واپس پناہ گاہ کی طرف کھینچتا ہے۔ پرویز عرف جمی کو بھی ایک ایسی ہی ڈور کھینچ رہی تھی۔ لیکن وہ واپس جانے سے پہلے اپنے روگی دل کا ہر گوشہ اپنے مسیحا کے سامنے عیاں کر دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار مریض کی طرح اپنے چارہ گر سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شروع سے لے کر آخر تک کی ساری کہانی ارجمند کو سنادی۔ اس کا نام ارجمند ہی تھا۔ اس نے ارجمند کو اپنے بے قرار شب وروز کے ہر ہر کرب سے آگاہ کیا' ہر ہر زخم کی کیفیت بتائی۔ اور جب سب کچھ بتا چکا تو ایک عاجز مریض کی طرح پُر امید نگاہوں سے مسیحا کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جمی کی روداد کے دوران ارجمند کے حسین چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے اور اب ان سب رنگوں پر الجھن اور کشمکش کا رنگ غالب آچکا تھا۔ وہ کچھ دیر نظریں جھکائے خاموش بیٹھی اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتی رہی۔ پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"دیکھئے پرویز صاحب.."

جمی نے اسے ٹوکا "میں آپ کو بار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے پرویز صاحب نہیں صرف پرویز کہیے۔"

ارجمند نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ پتا نہیں وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی یا شرمندگی۔ آخر چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولی تو اس کی آواز میں اعتماد تھا۔

"پرویز! میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔ اس قدر الگ کہ اگر تم ٹھنڈے دل سے غور کرو تو تمہیں خود بھی مایوسی ہوگی۔ .. میں بھلا اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

ارجمند کے جواب سے جمی کو کچھ ہمدردی سی محسوس ہوئی اپنے ان دو جملوں سے اگر ارجمند نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی تو حوصلہ شکنی بھی نہیں کی تھی۔ اس کی رگ رگ میں مسرت وانبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ دل چاہا کہ بے قرار ہو کر ارجمند کے دونوں ہاتھ تھام لے مگر وہ اس سے دور رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارجمند! میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں جو تمہیں ناپسند ہے اور وہ سب کچھ اپنا سکتا ہوں جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔ بولو مجھے کیا کرنا ہے؟ مجھے حکم دو کہ کون سا راستہ اپنانا ہے؟"

ارجمند اس کی وارفتگی پر دھیرے سے مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اتنی مدھم تھی کہ جمی کی عقابی نگاہیں بھی بمشکل دیکھ سکیں۔ اگلے ہی لمحے یہ مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

"فی الحال تو میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ... میرا مطلب

ہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں... میں خود ہی کسی طرح تم سے رابطہ قائم کروں گی۔"

ارجمند بہت جلدی میں لگتی تھی اور جی اس جلدی سے فائدہ اٹھالینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا" دیکھو ارجمند! میں اب تاریکی میں اور ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا۔ میں بغیر کسی آس امید کے تمہارا انتظار کر تا رہا ہوں۔ اب کوئی ایسا وعدہ کرو کہ مجھے اپنے انتظار کی طوالت کا علم ہوجائے..."

ارجمند منمنا کر رہ گئی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد جی نے اسے شیشے میں اتار لیا۔ اس نے ٹھیک تین روز بعد جی سے ایک ریستوران میں ملنے کا وعدہ کرلیا۔

ارجمند کو خدا حافظ کہہ کر اور اس کے والدین کے بارے میں اسے تسلی دے کر جی عقبی دیوار پھاند کر کوٹھی سے باہر آگیا اور پھر مختلف راستوں سے ہوتا ہوا اپنی پک اپ تک پہنچ گیا۔

اگلے تین روز اس نے جس طرح گزارے، کچھ اسی کو معلوم تھا۔ اسکول اور کالج میں وہ فراق اور وصال کے جن شعروں کا مطلب نہیں سمجھ پاتا تھا' اب ان سے اچھے شعر خود اس پر وارد ہو رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی بھی آگئی جب جی اور ارجمند کی ملاقات ہوئی۔ وہ ریستوران کے ایک پُرسکون کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ارجمند نے خود کو ایک موٹی، سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اجلے چہرے پر شربتی آنکھوں میں رنگ ہی رنگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ جی کی توقعات سے زیادہ باہمت ثابت ہو رہی تھی۔ شاید اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ اس رات صورتحال پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود جی نے اپنی فطری شرافت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے کسی بھی مشکل سے دو چار نہیں کیا تھا۔

اس ملاقات میں ارجمند نے جی سے کھل کر باتیں کیں۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ کہیں منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دو جگہ بات چل رہی ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ صرف ایک بھائی ہے جو کسی کام سے کراچی گیا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس سے پہلے وہ لاہور میں رہتے تھے اور وہاں وہ اپنی سہیلی فوزیہ قریشی کی شادی میں گئی تھی۔ عورت نے جب کچھ بتانا ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طور بتا ہی دیتی ہے۔ ارجمند نے بھی اپنی تمام تر محتاط گوئی کے باوجود پرویز جی کو بتادیا کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتی اور اگر وہ اپنے کردار اور ماحول میں کچھ تبدیلیاں لے آئے تو ان کے راستے جو بظاہر بہت الگ الگ نظر آتے ہیں، قریب آسکتے ہیں اور ہوسکتا ہے، کسی وقت یہ دونوں راستے مل کر ایک راستہ بن جائیں۔ ارجمند وہی کچھ چاہتی تھی جس کا جی نے شروع میں قیاس کیا تھا۔ وہ جی کے رہن سہن اور طور اطوار میں مکمل تبدیلی چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم کی طرف توجہ دے اور کچھ نہیں تو انٹر تو کر ہی لے۔ جی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جس میں مذہب کو کافی عمل دخل ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر نہ صرف ظاہری طور پر شریف نظر آئے بلکہ باطنی طور پر بھی اچھے اخلاق کا مالک ہو۔

پرویز جی نے ارجمند کے یہ سارے اشارے اپنے پلے سے باندھ لئے اور وہیں بیٹھے بیٹھے خود سے یہ عہد کرلیا کہ وہ ارجمند کو وہی کچھ بن کر دکھائے گا جو وہ چاہتی ہے۔ جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ان کے درمیان ایک نیم خاموش معاہدہ طے پاچکا تھا اور اس معاہدے کے تحت پانچ چھ ماہ کے اندر جی کو نہ صرف ایک باعزت روزگار تلاش کرنا تھا بلکہ خود کو ہر طرح ایک شریف آدمی کے روپ میں ڈھالنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا تھی۔

ارجمند نے جی سے وعدہ کیا کہ وہ ان چھ مہینوں میں اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ تاہم اس نے جی کو اس بات کی ضمانت دی کہ اس دوران اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوگا اور اس حوالے سے حالات جوں کے توں رہیں گے۔

○☆○

اگلے چار پانچ ماہ جی کے لئے انقلاب آفریں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کایا پلٹ گئی۔ چوری سے توبہ تو اس نے اسی وقت کرلی تھی جب ارجمند کو پہلی بار سوزوکی کار کی کھڑکی سے براہِ راست دیکھا تھا۔ اب اس نے صدقِ دل سے روزگار کی تلاش شروع کی اور اس تلاش میں کامیاب رہا۔ معلوم نہیں اس کامیابی میں اس کی قسمت کو زیادہ دخل تھا یا اس توانا جذبے کو جو اسے ارجمند کے لئے آسمان سے تارے توڑنے پر اکسا رہا تھا۔ اس نے ایک فروٹ جوس کارنر کھولا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک چھوٹے سے خوبصورت ریستوران میں تبدیل کردیا۔ اس دوران اس کے رہن سہن میں بھی نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے پتلون قمیص کا شوق پیدا ہوا۔ خودرو داڑھی کی جگہ کلین شیو نے لے لی۔ سر کے لمبے اور بے ڈھنگے بال ایک سنجیدہ اسٹائل میں ڈھل گئے۔ اس نے پان کھانا چھوڑ دیا۔ دندان ساز کو چار پانچ سو روپے دے کر اپنے دانت صاف کرائے اور انہیں باقاعدگی سے چمکانے لگا۔ اپنی چال ڈھال اور بول چال کو تبدیل کرنے کی اس نے شعوری کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ اب اس نے کسی حد تک مذہبی معاملات میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔

جس روز اس نے ایف اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ابھی اسے ارجمند سے جدائی کا

چلہ کاٹتے پانچ ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک ماہ کی دوری ابھی باقی تھی مگر پھر غیر متوقع طور پر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ جس روز انٹر کا رزلٹ نکلا اس سے اگلے روز ارجمند اس سے ملنے پہنچ گئی۔ ...یوں لگتا تھا' وہ اس کے پل پل کی مصروفیت سے آگاہ رہی تھی ...اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ جب وہ کار سے اتر کر ریستوران میں داخل ہوئی تو کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے ہوئے ججی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ شادیٔ مرگ کی کیفیت میں اپنی جانِ جاں کو دیکھتا رہ گیا۔ شاید اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دیدہ و دل فرشِ راہ کرے یا خود ہی اس کے قدموں میں نچھاور ہو جائے۔ ارجمند کی نگاہوں میں اس کے لئے ستائش اور محبت تھی۔ پرویز ججی نے آگے بڑھ کر دونوں سہیلیوں کا استقبال کیا۔ پھر ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ ارجمند سرخ رنگ کے لباس میں پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ ججی کے کچھ بتانے سے پہلے ہی ارجمند نے اسے کاروباری اور تعلیمی کامیابیوں پر مبارکباد دی پھر اسے بتایا کہ وہ اس کی پیش رفت سے پوری طرح مطمئن ہے۔ اور اسے آج ہی اپنے ابّو سے ملانا چاہتی ہے۔ اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ ججی اسی وقت تیار ہو گیا۔ اس کی رہائش بھی ریستوران میں ہی تھی۔ اندر جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنا بہترین لباس پہن کر باہر آ گیا۔ اچھی تراش کے لائٹ سوٹ میں وہ خوب جچ رہا تھا۔ ...ارجمند کے تاثرات سے صاف محسوس ہوا کہ اس نے اپنی توصیفی مسکراہٹ بمشکل روکی ہے۔ تینوں باہر کھڑی سوزوکی کار میں آ بیٹھے۔ ارجمند ڈرائیونگ کرنے لگی۔ اس کا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا۔

وہ جب گھر پہنچے تو ارجمند کے امّی ابّو پڑوسیوں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ایک ملازم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ارجمند نے اپنی سہیلی کو راستے ہی میں ڈراپ کر دیا تھا۔ اب ججی اور ارجمند ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے تھے۔ ارجمند بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا ہر انداز محبوبانہ تھا اور اس کی حسین آنکھوں کی ہر جنبش ججی کی دھڑکنوں کو تیز تر کر دیتی تھی۔ ارجمند کا رویہ اس کی توقعات سے زیادہ حوصلہ افزاء تھا۔

اس دوران صحن میں کچھ آہٹیں ہوئیں اور ارجمند کے والدین ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ارجمند نے شرماتے ہوئے ان سے ججی کا تعارف کرایا۔ اس کے والد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ججی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ...ارجمند کی والدہ نے بھی خوش اخلاقی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"اچھا تو یہ ہیں پرویز صاحب' جن کا تم اکثر ذکر کرتی ہو" ارجمند کے والد نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ جواب میں ارجمند نے مسکراتے ہوئے "جی ابّو" کہا۔

"بھئی بہت تعریفیں سنی ہیں تمہاری" اس دفعہ صاحبِ خانہ نے ججی کو مخاطب کیا۔ ججی صرف شرما کر رہ گیا۔ اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کہا جاتا ہے۔ اور کچھ کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔

"بیٹھو بیٹا" مستقبل کی ساس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا "تم دونوں آرام سے باتیں کرو' میں تمہارے لئے چائے بھجواتی ہوں۔"

ججی کپکپاتی ٹانگوں کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ارجمند نے مسکرا کر کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر قیامت کی چال چلتی باہر نکل گئی۔

ارجمند کے والد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے "ہاں بھئی' تمہارا غائبانہ تعارف تو ہے لیکن کچھ ادھورا سا ہے۔ کچھ اپنی زبان سے بتانا پسند کرو گے؟"

ججی نے اس راستے پر پورے خلوص سے قدم رکھا تھا لہٰذا اس نے ارجمند کے والد سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور اب تک جو جو حالات پیش آئے تھے' سب ان کے گوش گزار کر دیئے۔ وہ پوری توجہ سے سنتے رہے اور اپنی ننھی سی تسبیح تواتر کے ساتھ انگلیوں میں گھماتے رہے۔ لگتا تھا' تسبیح گھمانا ان کی عادت بن چکی ہے۔ ججی کی روداد ختم ہوئی اور وہ اپنا تفصیلی تعارف کرا چکا تو ارجمند کے والدِ بزرگوار نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس وقت کمرے میں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ دروازے بند تھے اور کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"تم سمجھدار نوجوان ہو اور اپنے پیشے میں مہارت بھی رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے تم اب تک صورتِ حال کو سمجھ ہی چکے ہو گے۔ بے بی چاہتی ہے کہ تم اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔ فی الحال میں تجرباتی طور پر پرسوں اسے تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں۔ ایک طرح پرسوں کا دن تمہاری قابلیت کا امتحان بھی ہو گا۔"

ججی کو بات کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "انکل ...میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..."

انکل نے مسکرا کر کہا "میں نے کوئی ایسی پیچیدہ بات تو نہیں کی۔ میرا خیال ہے' بے بی نے تھوڑا بہت تمہیں بتایا ہی ہو گا۔ پرویز میاں! بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے موٹے کام ہم سے نہیں ہوتے اور نہ ہی ہم نے کبھی کیے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ چھ چھ مہینے خالی بھی گزر جاتے ہیں لیکن جب بھی ہاتھ پیر ہلائے اس کی قیمت وصول کی ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے' آجکل اسپیشلائزیشن کا زمانہ ہے۔ جس طرح ڈاکٹر مختلف امراض کے اسپیشلسٹ ہوتے ہیں' اسی طرح اپنے پیشے میں ہم بھی شادیوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔ طریقۂ واردات کا کچھ تو

تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا' باقی...... بے بی خود ہی سمجھا دے گی۔ ...ویسے بھی تمہیں کسی بڑی مشکل سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ صرف دو اہم کام تمہارے ذمے ہیں۔ نمبر ایک۔ مقررہ وقت پر شادی والے گھر کی برقی رو کاٹنا۔ نمبر دو۔ بے بی کو لے کر وہاں سے نکل آنا..."

ارجمند کے والد بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن جبی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کے کانوں میں جیسے نشتر سے چبھنے لگے تھے۔ اس کی سماعت سے ٹکرانے والی گفتگو ایک خوفناک سمت میں اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے تصور میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو آج سے قریباً پانچ ماہ پہلے اسی ڈرائنگ روم میں ارجمند نے اس سے کہے تھے۔ آخر شب کی نیم تیرگی میں کہے گئے وہ الفاظ آج اپنا اصل مفہوم کھول رہے تھے...

ارجمند نے کہا تھا "پرویز' میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے۔ بہت الگ" اب جبی کی ناقص سمجھ میں آرہا تھا کہ راستے سے اس ستمگر کی مراد طریقِ واردات تھا... آہ! کس قدر اذیت ناک انکشاف تھا یہ۔ وہ پری چہرہ جو اس کے لئے شرافت' پاکیزگی اور دلربائی کا پیکر تھی' اسی کی طرح کی ایک چور نکلی تھی۔ خاندانی شرافت اور تہذیب کے نام پر جو کچھ اس کے ساتھ وابستہ تھا' سب جھوٹ اور فریب تھا۔ اور صرف جھوٹ اور فریب ہی نہیں تھا بلکہ ایک جرائم پیشہ فیملی کا مضبوط جال بھی تھا۔ اب جبی کی سمجھ میں آرہا تھا کہ ارجمند اسے ایک نیک' شریف اور برسرروزگار آدمی کے روپ میں کیوں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ اس نے خود بھی ایک نیک' پارسا لڑکی کا روپ دھار رکھا تھا۔ اسی روپ کو ڈھال بنا کر یہ لوگ سنگین وارداتیں کر رہے تھے... واقعی جبی کا راستہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ ایک چور تھا اور چور لگتا بھی تھا لیکن وہ لوگ چور تھے اور قطب لگتے تھے۔ ... بہت سے سوال جبی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن وہ ان کے جواب پوچھ کر ارجمند کے باپ کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ حالات اسے اس موڑ پر لے آئے ہیں' جہاں اسے سب کچھ خود بخود ہی معلوم ہو جائے گا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں اسے ارجمند اور اس کے گھرانے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ ارجمند کے والدین اس کے اصلی والدین نہیں۔ اس کا بھائی بھی صرف نام کا بھائی تھا۔ درحقیقت یہ سب لوگ ایک چھوٹے سے جرائم پیشہ گروہ کے ارکان تھے۔ اور ایک شریف و تعلیم یافتہ فیملی کے روپ میں اپنی رہائش بدلتے رہتے تھے۔ چوری کی واردات کے لئے ان کی منصوبہ بندی بڑی دوررس ہوتی تھی۔ یہ لوگ کسی ایسے ثروت مند گھرانے کا انتخاب کرتے تھے جس میں عنقریب لڑکی کی شادی ہونے والی ہو۔ پھر اسی علاقے میں یہ کوئی فلیٹ یا کوٹھی کرائے پر لے لیتے تھے۔ ارجمند ایک نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز لڑکی تھی۔ اسے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں آناً فاناً پروان چڑھانے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے شادی والے گھر میں کسی عورت کو ماں' بہن یا سہیلی بنا لیتی تھی۔ شادی کی مصروفیات اور رسومات میں اس کا کردار نہایت نمایاں ہوتا تھا۔ انہی دنوں میں وہ اندازہ لگا لیتی تھی کہ گھر کی قیمتی اشیاء کہاں کہاں ہیں اور کس کی تحویل میں ہیں۔ اس کا اصل ہدف دلہن کے زیورات ہوتے تھے۔ ان زیورات پر وہ شادی کی رات ہاتھ صاف کرتی تھی۔

جس وقت دلہن کو تیار کیا جاتا تھا' وہ اس کے اردگرد ہی موجود ہوتی تھی۔ پھر جب زیورات کے ڈبے نکالے جاتے تھے اور دلہن کو "پیلا" کرنے کے عمل کا آغاز ہونے لگتا تھا تو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ارجمند کا بھائی' جو اسی گھر کے مردانے میں موجود ہوتا تھا' مین سوئچ سے برقی رو بند کر دیتا تھا۔ زیورات کے ڈبے دلہن کے سامنے پہنچنے اور برقی رو بند ہونے میں اتنی درست ٹائمنگ کیسے ہوتی تھی' یہ جبی کے لئے بھی ایک معما تھا۔ لیکن یہ معما بھی آگے چل کر حل ہو گیا۔ برقی رو بند ہوتے ہی عورتیں حواس باختہ ہو جاتی تھیں۔ ...ارجمند جیولری کے ڈبے بغل میں دباتی تھی اور بہ آسانی کوٹھی سے باہر نکل آتی تھی۔ یہاں اس کا بھائی گاڑی لئے تیار موجود ہوتا تھا۔ اور یوں یہ واردات بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچتی تھی۔

ان تمام حالات سے آگاہ ہونے کے بعد جبی کی نگاہوں میں وہ فلم گھومنے لگی جو وہ ارجمند سے عاشقی کے دور میں بیسیوں بار دیکھ چکا تھا۔ اس فلم میں ارجمند کا ایک ایک انداز اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ نکاح کے بعد فلم اچانک اختتام پذیر کیوں ہو گئی تھی۔ یقیناً اس کے بعد کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی ہو گی اور دلہن والوں کی بدقسمتی کا آغاز ہو گیا ہو گا۔ جوں جوں جبی ماضی کی راکھ کرید رہا تھا' اس کے ذہن میں چنگاریاں سی بھرتی جا رہی تھیں۔ وہ ارجمند جس سے وہ پیار کرتا تھا' کہیں ہواؤں میں تحلیل ہو چکی تھی اور اب اس کے سامنے ایک بالکل مختلف کردار کی لڑکی کھڑی اپنی مکاریوں کی داد طلب کر رہی تھی۔ بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے اپنا طریقِ واردات سمجھا رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اس واردات میں اس کا کردار کیا ہے اور جبی کا کردار کیا!

O☆O

وہ جون کی ایک نسبتاً خوشگوار شام تھی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ارجمند کے گھر کی بالائی منزل پر

پرویز جی ایک کھڑکی کھولے آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ آج اسے ارجمند کے ساتھ بطور کزن شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے جانا تھا۔ دعوت نامہ تو سارے اہل خانہ کے نام تھا مگر ارجمند کے فرضی والدین نے بیماری کا عذر کر رکھا تھا جبکہ ارجمند کا بھائی ویسے ہی یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی کالی کمائی کے ساتھ کراچی میں کوئی کاروبار شروع کررہا تھا۔ ایک طرح سے اس کی خالی پوسٹ پر جی کو "بطور کزن" بھرتی کیا گیا تھا۔ اس کوٹھی کا تمام ضروری سامان دو روز پہلے ہی نہایت راز داری سے کسی دوسرے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ ارجمند کے "والدین" تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہورہے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ رفو چکر ہورہے تھے۔ ارجمند اور جی کو واردات کے بعد سیدھا ان کے پاس پہنچ جانا تھا۔ کہاں؟ اس کے بارے میں جی کو کچھ معلوم نہیں تھا تاہم اس کا خیال تھا کہ یہ نیا ٹھکانہ کسی دوسرے شہر میں کہیں ہوگا۔ اور کسی ایسے محلے میں ہوگا جہاں چند ہفتے بعد کسی امیر کبیر گھرانے میں کسی لڑکی کی شادی انجام پانے والی ہوگی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب کمرے سے باہر اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر ارجمند سرخ کامدار ساری میں ملبوس، بناؤ سنگھار کیے قدم قدم پر بجلیاں گراتی اندر آگئی۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مست خوشبوؤں نے جی کے سینے میں زلزلہ پیدا کردیا۔ اس کی مسکراہٹ جی کی نگاہوں کو چکاچوند کرنے لگی مگر اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر ذہن پر چھاتی ہوئی دھند کو صاف کردیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا کہ کاش اس کے پہلو میں ارجمند کے بجائے وہ بے نام لڑکی ہوتی جو کبھی اس کے خیالوں میں بستی تھی۔ جسم سے اٹھنے والی مہک، ہوش اڑانے والا گداز، یہ شباب و التفات اس معصوم لڑکی کا ہوتا جو اس وڈیو فلم میں بہار کے رنگین جھونکے کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ لیکن نہیں، یہ سب کچھ اس ارجمند کا تھا جس نے اسی کی طرح گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اور جو... اس کی ہم پیشہ بھی۔

ارجمند اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "تیار ہو؟"

جی نے بے خیالی میں ٹائی کی گرہ کو چھوا اور اثبات میں جواب دیا۔

ارجمند نے کہا "اچھا اب ایک بار پھر پوری تفصیل دہرا لیتے ہیں... ہم دونوں پیدل شادی والے گھر میں پہنچیں گے۔ تم اپنا تعارف شاہ صاحب کے بھانجے یعنی میرے کزن کے طور پر کراؤ گے۔ مجھے شادی والے گھر میں چھوڑ کر اور کچھ دیر مہمانوں میں بیٹھ کر تم واپس آؤ گے اور سفید سوزوکی کار لے جاؤ گے۔ یہ کار تم کوٹھی کے بائیں گیٹ کے پاس شہتوت کے درخت کے عین نیچے کھڑی کرو گے۔ یہ درخت تم کل اچھی طرح دیکھ چکے ہو۔ گاڑی کا رخ شمال کی طرف ہونا چاہئے۔ بفرض محال شہتوت کے نیچے کوئی اور گاڑی کھڑی ہو تو تم اپنی گاڑی اسی لائن میں آگے جاکر کھڑی کرسکتے ہو لیکن اس بات کی احتیاط تمہیں آخر وقت تک رکھنی ہوگی کہ ہمارے نکلنے کا راستہ مسدود نہ ہو۔" یہ کہتے ہوئے ارجمند نے اپنا نفیس ہینڈ بیگ کھولا۔ میک اپ کے سامان، ٹشو پیپرز اور نقدی وغیرہ کے درمیان ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی سیٹ پڑا تھا۔ ارجمند نے سیٹ کا ایک پیس اسے تھمادیا اور پھر بڑے انہماک سے اس کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگی۔ خالص مشرقی لباس میں اور گھریلو لڑکی کے لب ولہجے میں واکی ٹاکی کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے جی کو بتایا کہ ان کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوگی۔

"بارات تقریباً نو بجے پہنچے گی اور نکاح کے بعد اس کی طرف سے دو سگنل موصول ہوں گے۔ پہلا سگنل تیار رہنے کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد چند منٹ کے اندر اندر دوسرا سگنل ہوگا اور اس سگنل پر کوٹھی کی برقی رو کاٹ دینی ہوگی۔ اس نے جی کو سمجھاتے ہوئے کہا "میں اچھی طرح دیکھ چکی ہوں، کوٹھی میں جنریٹر نہیں ہے اور نہ ہی اس کا انتظام کیا گیا ہے۔ برقی رو کاٹنے کے بعد تم پوری طرح مطمئن ہوسکتے ہو۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، کوٹھی کا مین سوئچ گیراج میں ہے۔ بائیں دیوار پر پلائی ووڈ کا چھوٹا سا بکس ہے۔ اس میں کوئی تالا والا نہیں ہوتا۔ تم کسی بھی بہانے ٹہلتے ہوئے وہاں تک پہنچ سکتے ہو۔ ایک بار پھر میں تمہیں بتارہی ہوں کہ تمہیں مین سوئچ آف نہیں کرنا بلکہ گرپ نکالنے ہیں اور انہیں جیب میں ڈال لینا ہے۔ اس کام سے فارغ ہوکر تم بہ آسانی دس سیکنڈ میں کار تک پہنچ سکتے ہو۔ میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم گاڑی اسٹارٹ رکھو گے اور پچھلا دروازہ کھلا ہوا ہوگا۔ اگر تم چاہو تو ایمرجنسی لائٹ بھی آن کرسکتے ہو تاکہ مجھے گاڑی پہچاننے میں دشواری نہ ہو..."

پرویز جی پورے دھیان سے ارجمند کی باتیں سنتا رہا۔ جب اس کی ہدایات اختتام کو پہنچیں تو دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

O☆O

دعا کے بعد مبارک سلامت کا شور بلند ہوا اور چاق وچوبند بیرے مہمانوں میں مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تقسیم کرنے لگے۔ شادی کی یہ تقریب ایک وسیع وعریض لان میں ہورہی تھی۔ ہر طرف رنگ ونور کی بہار تھی۔ درختوں اور دیواروں پر کی جانے والی دیدہ زیب لائٹنگ نے ماحول کی خوبصورتی کو چار چاند لگادیے تھے۔ پرویز جی اپنا مٹھائی کا پیکٹ

کھولنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کی جیب میں رکھے واکی ٹاکی نے پہلا سگنل نشر کیا۔ ججی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ فیصلہ کن مرحلہ قریب آگیا تھا۔ وہ سگنل کی آواز اپنی گونجدار کھانسی میں چھپاتا ہوا اٹھا اور دھیمے قدموں سے گیراج کی طرف چل دیا۔ اس سے پہلے وہ گیراج کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ وہاں ایک نئے ماڈل کی ہنڈا گاڑی کھڑی تھی اور وہ اسے دیکھنے کے بہانے چار پانچ منٹ بہ آسانی گیراج میں گزار سکتا تھا۔

مین سوئچ والا بکس کھلا ہوا تھا اور نظر بچا کر اس میں سے "دو گرپ" کھینچ لینا ججی کے لئے چنداں مشکل نہیں تھا۔ وہ گیراج میں پہنچا اور گاڑی کے گرد آہستہ آہستہ گھوم کر تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے خطرہ صرف ایک ہی تھا۔ ...کہ کہیں کوئی دوسرا شوقین بھی اس کی دلچسپی دیکھ کر اظہارِ شوق کے لئے نہ پہنچ جائے۔ بہرحال ایسا نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے سرکتی رہیں۔ نہایت اضطراب کے عالم میں ججی نے کوئی سات منٹ گزارے۔ اس کے کان ہر لحظہ سگنل پر لگے ہوئے تھے... اور پھر اس کی جیب میں پڑی ہوئی ننھی منی خاموش مشین بول اٹھی۔ تین دفعہ "بپ... بپ" کی مخصوص آواز آئی۔ ججی نے یہ آواز سنتے ہی گرپ نکالنے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر مین سوئچ آف کردیا۔ تھری فیس.......

کنکشن منقطع ہوا تو یکلخت پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اس کے ساتھ ہی بالائی منزل سے عورتوں اور بچوں کی "ہاہو" سنائی دینے لگی۔ ججی تیز قدموں سے باہر نکلا اور سوزوکی کار کی طرف بڑھا۔ اسے بالائی منزل کی کھڑکیوں سے کچھ دبی دبی نسوانی چیخیں بھی سنائی دیں لیکن وہ ان چیخوں کو نظر انداز کرتا ہوا گاڑی میں آبیٹھا۔ اس نے ارجمند کی ہدایات کے مطابق انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کا رخ شمال کی طرف کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے گیٹ سے نکل کر ایک ہیولا تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ججی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگی۔ وہ ارجمند ہی تھی۔ وہ جب کچھ اور قریب آئی تو اس کے ہاتھوں میں زیورات کے ڈبے صاف دکھائی دینے لگے۔ وہ لپکتی ہوئی گاڑی تک آئی اور پھر ایک ہاتھ سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی... لیکن ججی نے اس کی آخری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ یعنی پچھلا دروازہ نہیں کھولا تھا۔ بلکہ اس وقت گاڑی کا کوئی بھی دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب پوری کوٹھی ایک بار پھر بقعۂ نور بن گئی۔ مین سوئچ پھر آن ہو چکا تھا۔ ارجمند کے حلق سے ایک مدھم سی چیخ نکل گئی۔ اس نے سخت اضطراب میں دروازے کا شیشہ کھٹکھٹایا اور غرائی "پرویز! دروازہ کھولو... جلدی کرو، دروازہ کھولو!"

پرویز اطمینان سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ ارجمند نے ہیجانی انداز میں دروازے کا ہینڈل کھینچنا شروع کردیا۔ وہ اب لرزاں آواز میں پکار رہی تھی "پرویز... پرویز... میں کہتی ہوں دروازہ کھولو... پاگل ہوئے ہو کیا؟" پرویز نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ کوٹھی کے گیٹ سے لوگ بھاگتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ ان میں عورتوں کے زرق برق لباس بھی چمک رہے تھے۔ اور ان سب کا رخ انہی کی طرف تھا۔ یکایک ارجمند نے دروازے کا ہینڈل چھوڑا اور مخالف سمت میں بھاگی۔ ...اس کی ساری کا کامدار پلو مضحکہ خیز انداز میں لہرا رہا تھا۔ عقب سے شور بلند ہوا "پکڑو... پکڑو... یہی ہے" ارجمند گاڑیوں کے درمیان راستہ بناتی پختہ سڑک تک آئی اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں پوری رفتار سے بھاگنے لگی لیکن دس بیس گز آگے جا کر اس کی اونچی ایڑی نے دھوکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گری۔ جیولری کے ڈبے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ اندر سے قیمتی جیولری نکل کر سڑک پر بکھر گئی۔ شاید اسی طرح ججی کے دل کے ٹکڑے اس کے سینے میں بکھرے ہوئے تھے۔

ججی نے گیئر لگا کر اطمینان سے اسٹیئرنگ گھمایا اور ایک بغلی سڑک پر سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور گلا جیسے نمکین آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ دس منٹ تک سیدھا چلنے کے بعد وہ ایک دوراہے پر آکر رک گیا۔ یہاں سے ایک سڑک اس مسجد کی طرف جاتی تھی جہاں وہ روزانہ فجر اور عشاء کی نماز پڑھا کرتا تھا۔ دوسری سڑک "پیرودھائی" اڈے کی طرف جاتی تھی۔ اس اڈے کے پاس وہ دو کمروں کا مکان تھا جہاں اس کے یارانِ ہم نوالہ و ہم پیالہ شکورا اور مراد مقیم تھے۔ وہ بہت دیر تک اس جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ عشاء کی نماز پڑھ لے۔ کبھی سوچتا کہ شکورے اور مراد کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں ایکسیلریٹر دباتا جا رہا تھا لیکن دوسرا پاؤں کلچ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ گاڑی دوراہے پر کھڑی غرا رہی تھی۔ فیصلہ بظاہر معمولی تھا لیکن بہت اہم بھی تھا۔ گاڑی غراتی رہی... دہاڑتی رہی۔ پھر اچانک اس کے ٹائر چرچرائے اور وہ پیرودھائی کی طرف مڑ گئی... پیرودھائی جہاں شکورا اور مراد اپنے بچھڑے یار کا انتظار کر رہے تھے۔

کتے کا ٹکٹ

ایک صاحب کتے کی زنجیر تھامے ریلوے کے ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچے اور کھڑکی کے اندر جھانک کر پوچھا "کیا مجھے کتے کا ٹکٹ لینا پڑے گا؟"

کاؤنٹر کلرک نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "نہیں جناب! ایسی بھی کیا بات ہے۔ آپ انسانوں کے ٹکٹ پر ہی سفر کرسکتے ہیں۔"